محمد حنیف ندوی

توحید اور اقدارِ حیات

(۴)

اگر توحید سے فکر و نظر کی صلاحیتیں ادر ضو افشاں ہوتی ہیں اور اگر اس تصوّرِ حیات سے عشق و محبت کے گلستاں میں بہار تازہ آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نظریہ سے کائنات میں انسان کے مقام کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ انسانی زندگی کی غرض و غایت مقرر اور واضح ہے - جو یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو اپنے مضمرات کے اعتبار سے عقل و بینش کے تقاضوں کو ترقی دے علوم و فنون کے قافلوں کو آگے بڑھائے اور یہ دیکھے کہ وہ کس حد تک اپنے گرد و پیش پھیلے ہوتے عالم پر قابو پا سکتا ہے اور کس حد تک اپنے بے پناہ تسخیری عزائم سے کام لے کر استفادہ کے دائروں کو وسیع تر کر سکتا ہے - دوسری طرف اس کے فرائض میں جو چیز داخل ہے وہ یہ ہے کہ یہ اپنے باطن میں غواصی کرے اور اپنی انا میں ڈوبے، اور یا کسی برتر انا سے تعلق و رابطہ پیدا کرے اور ان اقدار روحانی کا کھوج لگائے جو انسانی تہذیب کا اخلاص، محبت اور انسان دوستی سے بہرہ مند کر سکیں، نیز ایسی زندگی کی تخلیق کر سکیں جو دانش و بینش کی فراوانیوں کے ساتھ ساتھ عشق الٰہی کے داعیوں سے سرشار ہو - ظاہر ہے کہ اس طرح توحید نے انسان کے جس بلند مقام کی تعیین کی نشان دہی کی ہے وہ کسی صغریٰ کبریٰ پر مبنی نہیں، بلکہ خود اس کی فطرت سے عیاں ہے منطقی تعریف سے قطع نظر انسان آخر اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟ کہ عقل فزوں تر کے ساتھ ساتھ اقدار روحانی کی طلب و جستجو کی دولت بے پایاں کے احساس سے مالا مال ہے اور یہی وہ چیزیں تو ایسی ہیں کہ جن پر حقیقی انسانیت کا دار و مدار ہے، اور جن سے اس کی ہستی کا راز کھلتا اور اس کے وجود کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے - اور اس کائنات میں اس کا ٹھیک ٹھیک مصرف معلوم ہوتا ہے -

اس مرحلہ پر ہمیں اجازت دیجیے کہ ہیڈیگر (Hedegger) اور سارتر (Sartre) کے اس فلسفے کی پُر زور تردید کریں جس کی رُو سے انسانی وجود کے لیے کوئی منطقی

وجہ جواز پائی نہیں جاتی۔ یہی نہیں جس کی رُو سے انسانی زندگی محض ایک اہمال (MEANINGLESS) ہے۔ ایک لغویت ہے، اور ایسی فالتو شے ہے جس کی غرض وغایت اس عالم میں غیر متعین اور غیر عقلی ہے۔ اگر انسان میں بینش و دانش کی فراوانیاں موجود ہیں۔ اور اگر اس میں اقدار کا احساس پایا جاتا ہے تو کیا یہی اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ انسان اس دنیا میں بخت و اتفاق کی کسی کارفرمائی کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے وجود کی ایک علّت غائی ہے، ایک مقصد ہے جس کو کسی حکیم وعلیم نے مقرر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے ہم اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آئے، یہ بھی درست ہے کہ یہ دنیا جس میں ہمیں رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہاں کی ہر ہر چیز ہمارے خیالات و افکار پر، اور ہمارے منہاجِ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس خوفناک حقیقت کو بھی ہم مانتے ہیں، کہ انسانی زندگی اس درجہ بے مایہ ہے کہ موت کا ایک ہی جھٹکا اسے ختم کر دے سکتا ہے، اور یہ کہ ولولوں، تمناؤں اور کامیابیوں اور کامرانیوں کا وہ قصرِ رفیع جس کو یہ انسان برسوں کی جانفشانی اور محنت سے بناتا اور تیار کرتا ہے موت کا بے رحم ہاتھ پل بھر میں اس کو گرا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہی کہیں گے کہ انسانی زندگی مہمل نہیں۔ بامعنی اور بامقصد ہے اور اس عالم میں بیگانگی اور موت کے احساس سے جس حقیقت کا ترشح ہوتا ہے وہ یہ نہیں کہ زندگی مہمل ہے، بے معنی ہے۔ اور غرض وغایت سے تہی ہے۔ بلکہ جیسا کہ خود وجودی حکماء (EXISTENTIALIST) مانتے ہیں۔ اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زندگی بہت عزیز ہے، بہت قیمتی ہے، اور اس کا ایک لمحہ، اس کا ایک ایک پل ایسا ہے کہ جس میں ہمیں سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ موت اور خطرات حیات، جو ہر آن انسان کو گھیرے رہتے ہیں پکار پکار کہہ رہے ہیں کہ زندگی کی یہ مختصر گھڑیاں فضولیات میں صرف کر دینے کے لیے نہیں بخشی گئی ہیں۔ بلکہ یہ اس لیے ہیں تاکہ تم اس تھوڑے سے عرصہ میں اپنے لیے، اپنے بنی نوع کے لیے، اور اقدارِ حیات کے لیے کوئی گراں مایہ خدمت انجام دے سکو۔ ہم اگرچہ اس دنیا میں خود نہیں آئے۔ اور یہ دنیا اگرچہ ہماری مرضی کے مطابق نہیں بنی ہے۔ تاہم بینش و اختیار کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار جو ہمیں عطا کی گئی ہے ایسی عظیم تر ہے کہ جس سے ہم قوانینِ فطرت پر قابو پا سکتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے نئے نئے گلستان سجا سکتے ہیں۔ اور اخلاق و روحانیت کی شمیم آرائیوں سے اس چمن زار کو مہکا سکنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مزید براں یہاں کی ناہمواریوں کو

زندگی کی سازگاریوں میں ڈھال بھی سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہاں کی ہر شئے کو زوال ہے، یہاں کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا بنایا ہوا شاہ کار انسان بھی موت کے گھاٹ اترنے والا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ موت لبسا اوقات بڑا بھیانک رُوپ دھار لیتی ہے اور ایسی خوفناک صورت اختیار کر لیتی ہے کہ جس کی کوئی اخلاقی اور عقلی توجیہ ہم سے بن نہیں آتی۔ لیکن مشکل ہے کہ فطرت کی ان مجبوریوں کے باوجود ہم انسانی وجود کو غرض و غایت سے تہی مان لیں۔ کیوں کہ جب تک اس عالم میں قانون کا بول بالا ہے، جب تک اس میں نظم و ترتیب کی کارفرمائی ہے۔ اور جب تک اس عالم اور انسان کے مابین تعلق و ربط کی نوعیت عقلی ہے ہم مجبور ہیں کہ اس کے لیے غرض و غایت کی تعیین کریں۔ اور پھر اس غرض و غایت کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لیے خاص لائحہ عمل تجویز کریں۔

اس سلسلہ میں دراصل فیصلہ کن نقطہ یہ ہے کہ کیا اس عالم سے بہتر کسی عالم کی تخلیق فکر و فہم کی گرفت میں آتی ہے؟ کہ جس میں اس نوع کی مجبوریاں نہ پائی جائیں۔ کیا ایسے ارادے کی تخلیق ممکن ہے جو نیکی کا عزم رکھے لیکن برائی کے ارتکاب سے قاصر ہو۔ ایسی عقل کا تصوّر ممکن ہے جو خیر کے بارہ میں تو سوچے لیکن شر کا تعقل اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو۔ ہاتھ پاؤں اور زبان کی تخلیق و آفرینش میں کیا ایسے لوچ، یا ترتیب و ساخت کے لیے انداز کا ادراک سمجھ میں آتا ہے جس کی وجہ سے فعل صالح کے لیے تو یہ اعضا حرکت میں آسکیں، لیکن جونہی "غیر صالح اقدام" کی نوبت آئے یہ ساکن ہو جائیں، یا اس کی انجام دہی سے فوراً رک جائیں۔ روزمرہ کی زبان میں بتائیے۔ کیا ایسی تلوار آپ بتا سکتے ہیں، جو دشمن کا سر تو قلم کرے لیکن دوست کی گردن نہ کاٹ سکے۔

اگر جواب نفی میں ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ شر و نقص کی یہ صورتیں، ارادہ و اختیار، یا ہستی و وجود؛ اور اشیاء کا ایسا جزء ترکیبی ہیں کہ جن کے بغیر خود ان کا وجود ہی ممکن نہیں ہو پاتا۔ موت، بیماریاں، حوادث اور وہ خطرات جو ہر وقت انسان کو گھیرے رہتے ہیں، ان کی حیثیت بھی دراصل حیاتِ انسانی کے لیے ایسے ہی اجزاء ترکیبی کی ہے کہ جن کے بغیر زندگی کا حسین خواب پورا نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ ان کی حیثیت محض نفی (Negation) کی نہیں۔ بلکہ ان میں تعمیر کے بھی بے شمار مضمرات پائے جاتے ہیں

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان مسائل میں وجودی حکما کا اسلوبِ فکر قنوطی ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ ساری چیزیں جب خود ان کے نقطۂ نظر سے حیات یا وجود کی پہنائیوں میں داخل ہیں، اور ان کی حیثیت عرض (CONTINSENT) کی نہیں بلکہ اصل وجود (ESSENCE) کی ہے تو اس صورت میں ایسے وجود کو جو اپنے پہلو میں خیر کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی تعمیری شر بھی لیے ہوئے مہمل یا بے معنی (Absurd) کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسے وجود کا مطالبہ جو بیماری، زوال، انحطاط اور فساد و خلل کے امکانات سے معرّا ہو۔ بجائے خود تناقض لیے ہوئے نہیں۔

مہمل یا بے معنی شے ہمارے نزدیک وہ ہے جس سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں جس سے عقل انسانی کوئی کام نہ لے سکے۔ یا دوسرے لفظوں میں جس کی بناوٹ اور ساخت میں عقل و دانش کا کوئی حصہ نہ ہو۔ معدوم ہو جانے والی، یا زوال پذیر شے بے معنی نہیں۔ کیونکہ حیات و وجود کے محدود لمحے جن میں افادہ و استفادہ اور تعمیر و ترقی کا عمل جاری ہے، بہرحال اس غیر محدود عدم سے بہتر ہیں جس میں وجود و زندگی کا شعلہ سرے سے نہیں بھڑکتا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و جود میں کیا شبہ ہے۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ وجود کی ہر ہر صورت تکمیل و اتمام کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تکمیل و اتمام کی یہ کشتی اس وقت تک ساحلِ مراد کو نہیں چھو پاتی، جب تک کہ بحرِ وجود کے تھپیڑوں سے دوچار نہ ہو۔ اس کے تلاطم سے آشنا نہ ہو، اور اس کے پیدا کردہ حوادث کے طوفان میں سے گذر کر اپنے لیے راستہ نہ بنائے۔

یہاں اصل میں ایک اشکال سر اٹھاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و جود کے لیے کیا زیبا ہے؟ یہ کہ وہ یکتا و بے ہمتا، شانِ صمدیت میں مگن رہے اور کچھ بھی پیدا نہ کرے، یا ایسے مسجودِ ملائک انسان کی تخلیق کرے۔ جس کو بعض کمزوریوں اور تقاضاوات کے باوجود خلافتِ الٰہی کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا، اور اس عالمِ آب و گل کو ترقی کے انتہائی مضمرات تک پہنچانا ہے۔ دوسری صورت یقیناً زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

ہمارے وجودی حکما جس انسان کو اس درجہ بے چارہ، افتادہ اور مظلوم قرار دیتے ہیں ان کو فتویٰ دینے سے پہلے اس نقطہ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ فی الحال انسانیت کی تکمیل کب ہوئی ہے؟ یہ تو اس کا محض عبوری دَور ہے۔ اس گل کو ابھی گلستاں ہونا ہے۔ عقل و خرد کے خوارق دکھانا ہے۔ اور اخلاق اور اقدارِ روحانی کی شمیم آرائیوں سے پورے عالمِ امکان کو مہکانا ہے۔ اور آخر میں صحیح معنوں میں وہ شئے

ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے "خلیفہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ کا نائب! جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی صفات رنگا رنگ سے کسب ضیا کرنا ہے اور ان کی روشنی میں تہذیب و تمدن کے احاطوں کو از سر نو ترتیب دینا ہے۔ اس انداز سے توحید پر نظر ڈالیے تو یہی نہیں کہ اس سے اس کے موجودہ مقام و رتبہ کی تشریح ہوتی ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مضمرات عقلی و روحانی تخلیق و اختراع کی کن کن حسین منزلوں سے گذرنے والے ہیں۔

نظریۂ توحید جہاں فرد پر اثر انداز ہوتا اور اس کے اندازِ فکر کو بدلتا اور اس کے سامنے زندگی کے نئے نئے اُفق اُبھارتا ہے، وہاں معاشرہ کو بھی نظم، اخوت اور مساوات کے پیمانے عطا کرنے میں فیاضی سے کام لیتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے کاموں میں ایک طرح کا نظم اور ایک انداز کی ترتیب اور استواری ہے۔ ٹھیک اسی طرح موحد کی زندگی میں بھی نظم و قاعدہ کی جھلک کا پایا جانا ضروری ہے۔ زندگی کے لیے نظم و قاعدہ کی رعایتیں کس درجہ اہم ہیں۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت تک میں اس کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ نماز، روزہ اور حج کے لیے باقاعدہ ایک نقشہ اور نظام متعین فرمایا ہے۔ حالانکہ روحانیت اور عبادت کے بارہ میں فلسفیانہ تصوّر یہ ہے کہ اس کا تعلق صورت سے زیادہ معنی سے ہے چنانچہ رکوع و سجود اور قیام و قعود کی ایک متعین شکل ممکن ہے کسی درجہ میں مفید ہو اصل حقیقت یکسائی اللہ کا ذکر، اور اس سے تعلق و ربط کی نوعیت ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر طریقِ عبادت اور اسلوبِ ریاضت پر زور دیا جائے تو عبادت کی اصلی روح کو قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قلب و معنی کی ترکتازیوں پر نظم و قاعدہ کی پابندیوں کو عاید کرنا اس کی آزاد اور قید نا آشنا فطرت سے دغا کرنے کے مترادف ہے۔ عبادات کے بارہ میں یہ خالصتہً تعلیمیہ کا نقطۂ نظر ہے تفصیل کے لیے اخوان الصفا کے ان مقامات کو دیکھنا چاہیے۔ جس میں اس کے مرتبین نے فلسفۂ عبادت پر اظہار خیال کیا ہے۔ غزالی نے اپنی مشہور سرگذشت المنقذ من الضلال میں اس نوع کے افکار پر خصوصیت سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے قرامطہ یا تعلیمیہ سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے جن لطیف متکلمانہ ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے تھے۔ ان میں ایک کامیاب ہتھکنڈا یہ بھی تھا کہ یہ عبادات کے طریق پر زبانِ طعن دراز کرتے اور کہتے کہ بھلا ان پابندیوں میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو دین میں باطن کی اصلاح، قلب کا تزکیہ اور تعلق باللہ کی کیفیتیں ہیں۔ اس طرز فکر میں بنیادی غلطی ارسطو کے اس تصورِ الٰہ سے پیدا ہوئی کہ وہ عقلی بحث (PURE REASON) ہے اور چونکہ

وہ عقل بحث ہے لہٰذا عبادت یا اس سے تعلق و ربط کی صورت بھی وہی مکمل ہوگی جس میں شکل و ہیئت کی قدغن سے زیادہ فکر و تدبر کی کارفرمائی ہو، یعنی جس نسبت سے فکر و تدبر، مجرد اور جسمانی شوائب سے پاک ہوگا اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق بڑھے گا۔

بات یہ ہے کہ توحید دوئی اور ثنویت (DUALISM) کی مخالفت پر مبنی ہے اسلامی نقطۂ نظر سے نظم و ربط اور قاعدہ و آداب کی پابندیاں بھی اتنا ہی روحانی عمل ہیں جتنا کہ غور و فکر، تدبر و استغراق، اور اخلاص و یکسوئی، اسلام "انسان کو ایک وحدت فرض کرتا ہے اور اس کی تمام کوششوں کو ذہنی ہوں، یا عملی، روحانی قرار دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا تعلق رضائے الٰہی سے ہو۔ کانٹ (KANT) سچ کہتا ہے۔ کہ نیکی کا تعلق کسی فعل کی ترکیب، ساخت، نتیجے اور ثمرہ سے نہیں بلکہ نیت سے ہے۔ کوئی عمل روحانی ہے یا نہیں ہے۔ اس کی تعیین نفس عمل سے نہیں ہوتی بلکہ اس نیت یا موقف (ATTITUDE) سے ہوتی ہے جو عمل کا اصل محرک ہے اور حکیم یثرب کا یہ ارشاد "انما الاعمال بالنیات" بھی کیا اسی فلسفہ کی نشاندہی نہیں کرتا، زیادہ وضاحت کے لیے ہم یہ کہیں گے کہ روح و جسم کی یہ تفریق ہی سرے سے غیر اسلامی اور غیر قرآنی نقطۂ نظر کی حامل ہے" انسان روح و جسم کے دو الگ عناصر سے ترکیب پذیر حقیقت کا نام نہیں، بلکہ ایک ہی ایسے زندہ اور عاقل عنصر (INTELLECTUAL) سے تعبیر ہے، جو سوچتا، عمل کا نقشہ ترتیب دیتا اور اس کو انجام دینے کے لیے ذرائع اور وسائل کو کسی تنظیم کے تحت اختیار کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت، ایک عنصر اور ایک ہی وجود جب کسی جسمانی حرکت کو انجام دیتا ہے، تو ہم ازراہ سہل انگاری اسے جسم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور جب کوئی عقل و فکر کی بات کرتا ہے تو ہم اسے ذہن اور روح کا کرشمہ سمجھنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو حال (MODE) ہیں۔ دوئی اور ثنویت کا یہ گھپلا اصل میں زبان کی مجبوریوں نے پیدا کیا ہے۔ اور فلسفہ کی کتنی ہی گمراہیاں ہیں جن کو تخلیق میں زبان اور پیرایۂ بیان نے ایک خاص کردار ادا کیا ہے ورنہ انسان ایک ہے اور اس کا ہر عمل بیک وقت عقلی بھی ہے اور جسمانی بھی۔

اس نقطہ کو سمجھ لیجیے تو عبادت کا مفہوم بھی اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔ عبادت اور خصوصیت سے نماز صرف استغراق، غور و فکر اور مجرد تدبر کا نام نہیں، بلکہ ایسے عمل کا نام ہے جس میں پورا جسم اور پورا ذہن شریک ہو، جس کی انجام دہی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدنظر ہو۔ جس کا محرک تعلق باللہ کا پاکیزہ جذبہ ہو اور جس کی اساس تقویٰ اور عشق الٰہی پر استوار ہو۔ خالص فلسفہ کی زبان میں۔ اس ارسطاطالیسی تدبر کی آخر

حقیقت کیا ہے، جو اپنی فطرت میں مجرد (ABSTRACT) اور خالص (DURE) ہو۔ کیا فکر کے لیے موضوع (SUBJECT) کا ہونا شرط نہیں، شعور کی حاجت نہیں جو اس موضوع سے متاثر ہو۔ اور اس کے بارہ میں ایک متعین موقف اختیار کرے۔ اور ایسا آلہ شعور ضروری نہیں جو خود ایک لطیف جسم سے زیادہ نہیں؟

اس صورت میں فکر و تدبر کا عمل خالص اور مجرد روحانی عمل کیونکر قرار پائے گا۔ جب کہ اس میں موضوع بھی ہے، ذہن کا عمل بھی ہے اور خود وہ ذہن بھی شریک ہے، جو عملیہ شعور میں پورے جسم کے میکانزم کا رہین منت ہے۔ بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ نظریۂ توحید کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے زندگی نظم و قاعدہ کی برکتوں سے آشنا ہو جاتی ہے اور اس سے تعمیر سیرت یا کردار کے بناؤ سنوار میں مدد ملتی ہے۔ ضبط و نظم کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے عملی معنی یہ بھی ہیں کہ تمام بنی نوع انسان اور تمام مسلمان ایک ہیں۔ اور ان میں رنگ، نسل اور قوم کا کوئی تعصب نہیں پایا جاتا یعنی جہاں تک تہذیبی اور دینی و روحانی حقوق و مراعات کا تعلق ہے، ان کے حصول میں سب برابر ہیں، سب یکساں ہیں۔ بلال حبشی صہیب رومی اور سلمان فارسی کا رنگ و قومیت کے اختلاف کے باوجود اسلامی معاشرہ میں جو مقام ہے اس کو ہر کوئی جانتا ہے۔ تاریخی طور پر مہاجرین اور انصار میں۔ اخوت اور بھائی چارہ کا باقاعدہ آغاز اگرچہ مدینہ میں ہوا، تاہم جہاں تک نظریۂ توحید کے منطقی لوازم و نتائج کا تعلق ہے بلا خوف تردید کہنا چاہیے کہ جذبۂ اخوت و مساوات کو ان میں اولیں درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں جہاں جہاں بھی اسلام کے قدم پہنچے ہیں وہاں معاشرہ میں یہی فوری تبدیلی پیدا ہوئی ہے کہ تمام افراد ایک سلک میں منسلک ہو گئے ہیں۔ اخوت و مساوات کا تقاضا اسلامی معاشرہ کا جزو لاینفک ہے۔

اس حقیقت کو مسٹر آرنلڈ (ARNOLD) سے پوچھیے۔ انھوں نے پریچنگ آف اسلام میں اسلام کی اشاعت و فروغ کے جو اسباب بتلائے ہیں۔ ان میں صوفیا اور اولیاء کی تبلیغی کوششوں کے پہلو بہ پہلو جس سبب کو اہم قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام رنگ و نسل کے تعصبات کو ختم کر دیتا ہے اور معاشرہ کو ایسی خوش آیند وحدت میں ڈھال دیتا ہے جس میں کالے، گورے اور خواجہ و غلام کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ توحید کا یہ کردار اتنا واضح، اتنا جانا بوجھا اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

توحید کے متضمنات کے سلسلہ میں آخری سوال یہ ہے کہ اگر اس نظریۂ حیات کو معاشرہ پہ منطبق کیا جائے تو اس کے نتائج کیا ہوں گے، کیا اس سے انسانی معاشرہ کو متوازن بنانے میں مدد ملے گی۔ کیا اس سے قلق و اضطراب کی وہ شورشیں کم ہو سکیں گی جن کو اقتصادی ناہمواریوں نے پیدا کیا ہے یا دوٹوک انداز میں یوں کہیے کہ آیا توحید کے اجتماعی سے تصوّر سے فاصلوں کا وہ بُعد دور ہو سکے گا جو انسان اور انسان میں حائل ہے

یہ سوال اس لیے فکر و نظر کے سامنے آتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALIST) اپنے پورے جوبن اور نظری تضادات کے ساتھ جس طرح آج رونما ہے اس طرح تاریخ کے کسی دَور میں رونما نہیں ہوا ہے۔ صنعتی ارتقاء اور اکتناز ثروت نے واضح طور پر انسانیت، اور تہذیب کو دو مستقل بالذات گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ چنانچہ اب عالمِ انسانی کا حال یہ ہے کہ ایک ہی قوم میں دو قومیں، ایک ہی ملّت میں، دو ملّتیں اور ایک ہی معاشرہ میں۔ دو جُدا جُدا معاشرتی نظام کے حامل حلقے ابھر آتے ہیں۔ ایک حلقہ نے نہ صرف دولت و ثروت کی فراوانیوں اور عیش و عشرت کی طرفہ طرازیوں کو اپنے دامن حرص و آز میں سمیٹ لیا ہے۔ بلکہ ذرائع دولت پر بھی انھیں کا قبضہ اور اجارہ داری ہے۔ دوسرا گروہ قدرتاً مفلس و نادار، تہی دست اور محتاج ہے۔ لطف یہ ہے کہ آہستہ آہستہ گھٹنے اور کم ہونے کے بجائے معاشرہ کی یہ ناہمواری روز بروز زیادہ تیکھی اور تیز ہوتی جا رہی ہے۔ افلاس و غنا، کا یہ اضافی اور ناقابلِ امتیاز فرق کب قائم نہیں رہا ہے۔ جب تک مدارجِ ذہنی کا، تجربہ و مہارت کا، اور تخلیق و آفرینش کی قوتوں کا فرق انسانوں میں موجود ہے۔ اس وقت تک یہ ضروری ہے کہ افلاس و غنا کا یہ اضافی اور معمولی فرق قائم رہے، اس لیے یہ چیز بجائے خود تشویش ناک بھی نہیں چنانچہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو صنعتی ارتقا کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے بنیادی خرابی یا تشویش ناک پہلو یہ نہیں کہ اس نے غنا اور افلاس کے ان فطری حدود کو قائم رکھا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہیں۔ اس کی بنیادی خرابی اور اس کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ اقتصادیات کے اس نہج نے دولت اور ذرائع دولت دونوں کو بیک وقت سرمایہ دار کی جھولی میں ڈال دیا ہے اور اس اجارہ داری کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سیاسی قوت اور تہذیبی اقدار پر بھی اس گروہ کا تسلط قائم ہو گیا ہے۔

اس مرحلہ پر آپ پوچھیں گے کہ اس اشکال یا اوگن گھاٹی سے بچ نکلنے کی سبیل کیا ہے؟ ہمارا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ نظریۂ توحید کے مضمرات اجتماعی کا جائزہ لیجیے۔ اور پھر ان مضمرات کو معاشرہ پر منطبق کر کے دیکھیے۔ اگر خدا ایک ہے اور مخلوقِ خدا پر صرف اسی ذاتِ گرامی کو حکمرانی کا حق ہے اور اگر رازق

ایک ہے اور اسی رازق کے ذمہ یہ بات ہے کہ وہ اپنے بندوں کی معاشی ضروریات کا متکفل ہو، تو پھر یہ حقیقت نکھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے معاشرہ میں اقدار اور تہذیبوں کی یہ دوئی نہیں ہونی چاہیے۔ رزق اور اسباب پر کسی گروہ کی اجارہ داری قائم نہیں رہنا چاہیے، اور ان تمام فاصلوں اور دُوریوں کو بالآخر کم ہونا چاہیے، جن کو ہمارے غیر عادلانہ اقتصادی نظام نے پیدا کر رکھا ہے توحید اور ایسے یکساں و متوازن معاشرہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے جس میں ہر ہر انسان کو ضروریاتِ زندگی سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ ان تمام آسایشوں میں برابر کا حصّہ ملے، جن کو موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جنم دیا ہے ⁂

اسلام کا نظریۂ تاریخ

(از مظہر الدین صدیقی)

اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ اصولِ تاریخ صرف گذشتہ اقوام کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ موجودہ قوموں کے لیے بھی بصیرت افروز ہیں۔ قیمت : ۳/۵۰ روپے

قرآن اور علمِ جدید

(از: ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

اس کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور قرآن کے درمیان کیا رشتہ ہے اور وہ ہمارے روزہ مرّہ کے مسائل و مشکلات کو کس طرح حل کرتا ہے۔ قیمت: ۶/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور